ابوالعلاء معرّی.....ا

عربی شاعری میں فکر و فلسفہ اور یاس و برہمی کی آواز

☆ یہ زندگی تمام کوفت اور تھکن ہے
مجھے حیرت اس پہ ہے جو زیادہ جینے کی آرزو رکھتا ہے
تم رہین آفاتِ زمانہ ہو اور ان سے کبھی رہائی نہ پاؤ گے
چاہے اس امید میں کتنے ہی گرما و زمستاں گذار دو

☆ اے موت: اب نزول کر کہ یہ زندگی مذموم ہو چلی ہے
اور اے نفس: متانت کا دامن تھام کہ زمانے نے تمسخر اختیار کیا ہے۔

اپنی قبر کے لئے کتبہ

☆ یہ ظلم میرے باپ نے مجھ پر کیا تھا' میں نے یہ ظلم کسی پر نہیں کیا۔

زندگی کے بارے میں یہ خیال کہ یہ مصائب و آلام کا مجموعہ ہے جن سے انسان مر کر ہی نجات پا سکتا ہے کوئی نیا نہیں ہے۔ جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے اور اس زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کیا ہے اس نے اپنے آپ کو عموماً دکھوں میں گھرا ہو اور مسائل و مشکلات سے دوچار ہی محسوس کیا ہے۔ اس کا یہ احساس جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو زندگی اس کے لئے ایک بوجھ بن جاتی ہے اور وہ تمنا کرنے لگتا ہے کہ کاش وہ اس دنیا میں نہ آیا ہوتا..... مسیح سے سات سو برس پہلے یونانی شاعر ہومر' جو ویسے ایک خوش فکر شاعر تھا۔ اپنی رزمیہ نظم ''ایلیڈ'' میں کہتا ہے: ''جتنی چیزیں بھی یہاں (اس دنیا میں) ہیں اور سانس لیتی ہیں' ان میں انسان سے زیادہ بدنصیب اور کوئی نہیں۔'' پھر

پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان ہی کا تمثیل نگار سوفوکلیز اپنے ایک المیہ ڈرامے ''ایڈی پس اٹ کولونس'' میں لکھتا ہے کہ ''اس دنیا میں پیدا نہ ہونا سب سے اچھی اور پسندیدہ بات ہے لیکن جب انسان ایک دفعہ پیدا ہو جائے تو پھر اس سے اچھی بات اور کوئی نہیں کہ جتنا جلد ہو سکے وہ وہیں لوٹ جائے جہاں سے آیا تھا'' ..... اِدھر مشرق میں بدھ مت کی ابتدا ہی اس نظریے سے ہوتی ہے کہ برائی اور دکھ انسان کی ذات میں ازل سے موجود ہیں' اور یہ زندگی اپنی حقیقت میں ایک مصیبت ہے جس سے انسان کو' جب تک اس میں شعور و آگہی باقی ہے' کبھی نجات نہیں ملے گی۔ اس کے پس منظر میں ویدانت کا وہ فلسفہ ہے جس کے مطابق آتما (روح) ہی اصل اور حقیقت ہے' باقی جو کچھ ہے (یعنی یہ دنیا اور اس کے مظاہر) سب مایا ہے' دھوکا ہے' سراب ہے' اس لئے خرابی اور برائی اس کے خمیر میں رچی ہوئی ہے' اور وہ شخص بڑا نادان ہے جو عکس کو اصل سمجھ لیتا ہے اور اپنی جان ایسی باتوں میں کھپائے رکھتا ہے جو سراسر بے حقیقت اور فریب ہیں۔

ہندو یونان کے حکماء اور ادباء کے یہاں سوچ کا یہ انداز تو سمجھ میں آتا ہے کہ اس کے پیچھے فکر و دانش کی ایک تاریخ تھی' ایک طویل روایت تھی۔ لیکن جب خلافتِ عباسیہ کے مسلم معاشرے میں پروان چڑھنے والا ایک عرب شاعر اُٹھ کر اس طرح کی بات کرتا ہے کہ

تَعَبٌ كلها الحياةُ فما أعجَبُ الاّ مِن راغبٍ فی ازدیاد

یہ زندگی تمام کوفت اور تھکن ہے۔ مجھے حیرت اُس پہ ہے جو اس میں زیادہ جینے کی آرزو کرتا ہے۔

یا وہ اپنے ارگرد ہونے والے ظلم اور ناانصافی سے مایوس ہو کر موت کی طرف دیکھتا اور اسے آواز دیتا ہے:

فیا موتُ زُرْ ان الحياة ذميمة

اے موت! اب نزول کر کہ یہ زندگی مذموم ہو چلی ہے.....

تو سننے والے کو اچنبھا ہوتا ہے اور یہ بات کئی اعتبار سے بڑی انوکھی لگتی ہے۔ اولاً اس لئے کہ یہ عرب شاعر مذہباً مسلمان تھا' اور اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تعلیمات میں حیات بعد الموت کے عقیدے کی وجہ سے رجائیت کا ایک مثبت عنصر بہر حال موجود ہوتا ہے۔ مذاہب کا کہنا یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی بھلے ہی مصائب و آفات سے پُر ہو' آخر چند روزہ ہے اور ایک دن ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جو ہمیشہ باقی رہے گی' اور اس میں مذہب کی راہ پر چلنے والے انسان کو ان سارے دکھوں' محرومیوں اور ناانصافیوں کے بدلے میں' جو اس نے اس زندگی میں جھیلی ہوں گی' راحت' آسودگی اور عیش و آرام میسر ہوگا۔ دوسرے اس وجہ سے کہ ایک عرب شاعر کا زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا اور ایک نتیجے پر پہنچنا اور پھر اپنی خاص فکر اور اپنے انفرادی احساس کا اظہار اپنے شعروں میں کرنا اس وقت کی شاعری کی عام ڈگر سے ہٹی ہوئی ایک چیز تھی۔ کوئی شک نہیں کہ عربی شاعری نے زمانۂ جاہلیت سے چل کر عباسی دورِ حکوت کے وسطی زمانے تک پہنچتے پہنچتے بہت سے مدارج طے کر لئے تھے اور اس کی ہئیت اور اسلوب میں اچھی خاصی تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں۔ پھر ہمسایہ عجمی تہذیبوں کے اثر سے اس میں کچھ زاہدانہ وصوفیانہ اور کسی حد تک فلسفیانہ مضامین بھی راہ پانے لگے تھے لیکن اس سارے ارتقاء کے باوجود یہ شاعری اپنے روایتی موضوعات (مدح و فخر' مرثیہ' ہجو' وصف و بیان وغیرہ) کے دائرے سے باہر کم ہی نکلی تھی۔ رہا فکر و فلسفہ اور حیات و کائنات کے بارے میں سوچ بچار اور خیر و شر' عقل و وجدان اور جبر و اختیار کے مسائل پر گفتگو اور رائے زنی' تو یہ باتیں اس سے پہلے عربی شاعری کا موضوع کبھی نہیں بنی تھیں اور نہ شعراء نے اپنی نظموں کو اس طرح کی مفکرانہ آراء کے اظہار کا وسیلہ بنانے کی طرف زیادہ دھیان دیا تھا۔

عربی شاعری کو یہ نیا لہجہ دینے اور اسے ایک بالکل نئی راہ پر چلانے والا یہ شاعر ابو العلاء معرّی تھا جو آج سے تقریباً ایک ہزار سال قبل ملک شام کی ایک آبادی معرّۃ

المعمان میں پیدا ہوا اور جس نے خلافتِ عباسیہ کا وسطی زمانہ دیکھا بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں بسر کیا تھا۔ اس لئے کہ ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی اور اس نے زندگی کے اسّی طویل برس نابینائی کے گھپ اندھیرے میں گزارے تھے۔ معرّی عربی ادب کی تاریخ کے ایک ایسے دور کے آخر میں آتا ہے جو عام مؤرخین کے نزدیک نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ فکری، ثقافتی اور ادبی اعتبار سے بھی ایک سنہری دور تھا۔ اِس (عباسی) دور میں اُس سے پہلے بشّار بن بُرد، ابوالعتاہیہ، ابونواس، ابوتمام، بحتری اور متنبّی جیسے اکابر شعراء گزر چکے تھے۔ اور خصوصیت کے ساتھ متنبّی جیسے قدر آور شاعر کے بعد تو یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے طرزِ سخن کی آب و تاب کے سامنے اب صدیوں تک کسی شاعر کا چراغ نہ جل سکے گا۔ لیکن متنبّی کے تھوڑا عرصہ بعد ہی ابوالعلاء معرّی کی آواز نے دنیا کو چونکا دیا، اور لوگوں نے دیکھا کہ ایک اور اتنا ہی بڑا جینیس عربی شاعری کے اُفق پر نمودار ہوا ہے۔ یہ آواز اتنی اچھوتی، اتنی مختلف اور اپنے اندر فکر اور سوچ کا ایسا طاقتور عُنصر لئے ہوئے تھی کہ لوگ چاہے اس سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوں یا نہ، اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پھر آگے چل کر اہلِ مشرق سے زیادہ اہلِ مغرب نے اس شاعر میں دلچسپی لینی شروع کی اور اسے اپنے مطالعے اور تحقیق کا موضوع بنایا۔ چنانچہ پچھلی چند صدیوں میں جتنا کام ابوالعلاء معرّی پر مختلف یورپی ممالک میں ہوا ہے اتنا کسی اور عربی شاعر یا ادیب پر نہیں ہوا۔ انگلستان کے مارگولیوتھ سے لیکر جرمنی کے فان کریمر اور بروکلمان تک اور فرانس کے مسینیوں اور ہنری لاؤسٹ سے لے کر روس کے کراکووسکی تک، ایک درجن کے قریب نامور مستشرقین ایسے ہیں جنہوں نے معرّۃ النعمان کے اس نابینا شاعر کی زندگی اور فن کے بارے میں بہت قابلِ قدر کام کیا ہے۔

معرّی کی شاعری اور شخصیت میں وہ کیا خاص بات ہے جس میں وہ عربی شعرو ادب کی پوری تاریخ میں اتنا منفرد اور مختلف دکھائی دیتا ہے، اس کی آواز سب آوازوں سے الگ پہچانی جاتی ہے اور اس کے فن پر بحث و تحقیق اور مطالعے و مباحثے کا سلسلہ

ابھی تک جاری ہے؟ ان سوالات کا جواب قاری کو اس مضمون میں مناسب موقعوں پر مل جائے گا۔ تاہم ابتدائی تعارف کے طور پر معرّی کی شخصیت اور اسلوبِ شعر کی بعض نمایاں خصوصیات کا ایک مختصر ذکر یہاں نامناسب نہیں ہوگا۔

☆ معرّی پہلا عرب شاعر ہے (اور ایک لحاظ سے آخری بھی) جس نے خالص 'فکر' کو اپنی شاعری کے ایک غالب حصے کا موضوع بنایا' اور اُن سب روایتی موضوعات کو جو زمانۂ جاہلیت سے عربی شاعری میں مقبول و مروّج چلے آتے تھے یک قلم ترک کر کے اپنے ایک بڑے اور اہم دیوان ''لزوم مالا یلزم'' (مختصراً ''لزومیات'') کو اپنے فکر و نظریات کے لئے وقف کر دیا۔

☆ فکر کی شاعری کرتے ہوئے معرّی نے اپنے کلام کی فن کارانہ تزئین و آرائش سے مکمل اجتناب کیا' اور اپنی شاعری میں حسن بیان سے زیادہ ابلاغِ معنی کو اہمیت دیتے ہوئے ایک ایسا سادہ اور بے تکلف طرزِ سخن اختیار کیا جسے دوسری زبانوں میں منتقل کرنا عربوں کی عام شاعری کی بہ نسبت بہت آسان[1] پایا گیا۔

☆ اپنی روایات اور مذہبی تعلیمات کے برعکس اس نے ایمان و وجدان کے مقابلے میں عقل و خرد کو برتر وسیلۂ علم قرار دیا اور اپنے شعروں میں عقل کی فضیلت پر زور دیا۔ اس نے مذہب کی ظاہری اور رسمی صورت کی' جو اس وقت معاشرے میں رائج تھی' کھل کر مذمت کی اور ایسا کرتے ہوئے اس نے اسلام سمیت تمام مذاہب کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔

☆ اس نے صرف شاعری ہی نہ کی' بلکہ نثر بھی لکھی اور نثر میں ایک رسالہ (رسالۃ الغفران) ایسا لکھا جس کے متعلق مغرب کے بعض اہلِ نظر نے بھی تسلیم کیا کہ اُس نے اطالوی شاعر دانتے کی ''طربیۂ خداوندی'' (Divine Comedy) کے

۱۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ترجمے کی چھلنی سے گذر کر جہاں عربوں کی بیشتر قدیم شاعری اپنا بہت سا حسن اور تاثیر کھو دیتی ہے' وہاں معرّی کی شاعری زیادہ کچھ کھوئے بغیر دوسری زبان کے جامے میں بھی اپنا جوہر برقرار رکھتی ہے۔ مغربی دنیا میں اس کی شاعری کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

لئے نمونے کا کام دیا تھا۔

☆ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حیات اور سرشتِ انسانی کے بارے میں اس نے خالصۃً قنوطی نقطۂ نظر قائم کیا۔ اور اس دنیا کی زندگی کو سراسر دکھ اور کوفت قرار دیتے ہوئے اُسے رد کیا' اور انسان کے 'نہ ہونے' کو اس کے 'ہونے' سے بہتر بتایا۔ اپنے نظریے پر عمل کرتے ہوئے اس نے کبھی شادی نہ کی' کہ اپنی صلب سے کچھ اَور انسانی افراد کو اس دنیا میں لانے کا مطلب یہی ہوگا کہ ان کو بھی جینے کے عذاب میں مبتلا کیا جائے۔ چنانچہ اپنی وفات سے قبل اپنی قبر کے لیے جو کتبہ تجویز کیا وہ اس کے اسی خیال کا اظہار تھا:

هذا جناه ابی علی و ما جنیت علی احد

یہ ظلم میرے باپ نے مجھ پر کیا تھا۔ مگر میں نے یہ ظلم کسی پر نہیں کیا۔

معرّی کی شاعری اور اس کی زندگی کے حالات پڑھتے ہوئے کچھ ایسے سوالات قاری کے ذہن میں اُبھرتے ہیں جن کے بارے میں ایک سے زیادہ اور باہم متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ابوالعلاء بنیادی طور پر شاعر تھا' یا مفکر و فلسفی؟ اور جب اپنی فکر میں وہ ایمان و وجدان کے مقابلے میں عقل کی برتری تسلیم کرتا ہے تو کیا وہ ایک مسلمان کہلایا جا سکتا ہے؟..... اسی طرح زندگی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر! کیا یہ انسان کو لازماً قنوطیت کی طرف لے جاتا ہے یا یہ اسے محض حقیقت پسندی پر آمادہ کرتا ہے اور اسے زندگی کے روشن پہلوؤں کے ساتھ ساتھ تاریک پہلو بھی دیکھنے کے لئے کہتا ہے۔ اور اگر اس کا یہ رویہ کڑی قنوطیت (Stark pessimism) ہے تو ایسا کیوں ہے؟ اور اس کے پیچھے کیا مخصوص حالات تھے؟..... ابوالعلاء معرّی کے بارے میں یہ سوال بہت اہم اور برمحل ہیں' اور ان پر بحث و مناقشے کا سلسلہ جو ایک عرصۂ دراز سے جاری ہے ابھی تک ختم نہیں ہوا' اس مضمون میں ان سوالات میں سے ہر ایک کا ایسا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی جو حقائق سے دور بھی نہ ہو اور عقل و درایت کو بھی زیادہ سے زیادہ مطمئن کر سکے!

☆.....☆.....☆

ابوالعلاء معری کی زندگی کے بارے میں کچھ جاننے کے لئے ہم تاریخ میں ایک ہزار سال پیچھے چلتے ہیں ..... یہ دسویں صدی عیسوی کا ربعِ آخر ہے۔ دولتِ عباسیہ اپنے عروج و شباب کے سنہری دور کو ڈیڑھ صدی پیچھے چھوڑ کر اب ادھیڑ عمر کے عہدِ ضعف و درماندگی سے گذر رہی ہے' جس میں ایران کا بُویہ خاندان بغداد میں آ کر امورِ خلافت پر عملاً قابض ہو چکا ہے اور خلیفۂ عباسی کی حیثیت محض ایک پنشن خوار اور نام کے حکمران کی رہ گئی ہے جسے بُویہی ''امیر الامراء'' جب چاہتے ہیں معزول کر دیتے ہیں اور اس کی جگہ دوسرے خلیفہ کو تخت پر بٹھا دیتے ہیں۔ دنیا کے ایک بڑے حصے پر پھیلی ہوئی مسلم سلطنت کا کوئی مرکز اقتدار باقی نہیں رہا۔ بلکہ اقتدار اب چار مراکز پر بٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بغداد میں نام کی حکمرانی عباسی خلیفہ الطائع باللہ کی ہے جبکہ اصل حکمران بُویہی امیر عضدالدولہ ہے۔ مصر میں فاطمی خلفاء کا سکہ چلتا ہے اور خطبوں میں اولوالامر کے طور پر انہی کا نام لیا جاتا ہے۔ وہ اپنی طاقت کی وجہ سے شام و حجاز کے لئے ایک مستقل خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ ادھر شمالی شام میں۔ جو ہمارے شاعر کا وطن ہے۔ بنوحمدان کی چھوٹی سی حکومت قائم ہے' جو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے شمال میں بازنطینی حکومت سے مسلسل برسرِ پیکار چلی آتی ہے۔ حمدانی حکومت کے طاقتور' علم دوست اور ادب پرور امیر سیف الدولہ کا عہد ختم ہوئے ابھی چند ہی برس گذرے ہیں اور نہ صرف شام بلکہ پورے عرب کی فضا میں نامور شاعر متنبّی کے ان قصائد کی گونج سنائی دیتی ہے جو اس نے اس صاحبِ ذوق امیر کی مدح میں نظم کئے تھے۔ اقتدار کا ایک اور مرکز غرناطہ ہے جہاں بنوامیہ کی اندلسی حکومت کے سب سے طاقتور اور لائق ترین خلیفہ عبدالرحمان الناصر کا عہد تمام ہوئے صرف چودہ برس گذرے ہیں اور اس کے نتیجے میں اِدھر اُدھر جن فتنوں نے سر اٹھایا تھا اُن سے نیا خلیفہ حکم ثانی نمٹنے میں مصروف ہے۔

اس تاریخی پس منظر میں اب ہم زمان و مکان کے تعین کے ساتھ بات کرتے

ہیں.....سال ۳۶۳ھ (۹۷۳عیسوی) تھا اور بستی معرۃ النعمان تھی جو حلب کے جنوب میں جانے والی شاہراہ پر بیس میل کی مسافت پر واقع ہے۔ یہاں ایک تنوخی خاندان میں جس کے افراد زیادہ تر عالم' قاضی اور شاعر تھے' ۲۸ ربیع الاول کو جمعہ کے روز غروب آفتاب کے وقت ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام احمد اور کنیت ابوالعلاء رکھی گئی۔ یہ لڑکا ابھی ساڑھے تین برس کا تھا کہ اس پر چیچک کے مرض نے حملہ کیا' جس کے نتیجے میں اس کا چہرہ تو داغدار ہوا ہی تھا' اس کی بائیں آنکھ کی بینائی بھی جاتی رہی اور دائیں آنکھ میں سفیدی اترنی شروع ہوئی۔ چھ برس کی عمر کو پہنچ کر یہ لڑکا پوری طرح نابینا ہو گیا۔ اپنے بچپن کے اس حادثے کا ذکر کرتے ہوئے آگے چل کر ابوالعلاء داعی الدعاۃ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

وقدعلِم اللّٰہُ أنّ سمعی ثقیل و بصری عن الابصار کلیل' وقُضی علیَّ و انا ابن أربعٍ لاافرّق بین البازل والرُّبع.

اللہ جانتا ہے کہ میری سماعت میں ثقل ہے اور میری آنکھ دیکھنے سے قاصر ہے جب میں چار برس کا تھا تو میری تقدیر میں یہی لکھا گیا کہ میں شتر اور بچہ شتر میں تمیز نہ کر سکوں۔

ایک اور موقع پر وہ رنگوں کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے ''رنگوں میں سے میں صرف لال رنگ جانتا ہوں' اس لئے کہ چیچک کے مرض میں مجھے جو کپڑا پہنایا گیا وہ کسنبھ[1] میں رنگا ہوا تھا اس کے علاوہ کوئی رنگ میرے ذہن میں نہیں آتا۔'' مصنف ابن العدیم نے اس زمانے کے ایک شخص ابومنقذ کا قول نقل کیا ہے جس نے ابوالعلاء کو اس کے بچپن میں دیکھا تھا۔ وہ اس کا حلیہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے ''وہ ایک چیچک زدہ چہرے والا بدرُو لڑکا تھا' ماتا کی وجہ سے اس کی آنکھوں پر سفیدی چھا گئی تھی۔ اور یوں لگتا تھا جیسے ایک آنکھ سے اسے صرف پرچھائیں سی دکھائی دیتی ہے''۔

ابوالعلاء کے گھرانے میں علم تھا' شاعری تھی اور عہدۂ قضا تھا۔ اس گھریلو ماحول

۱۔ عربی میں العصفر یعنی safflower ہندی میں اسے کسنبھ' کسنب یا مختصراً کسم کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام زعفرانِ کاذب ہے اور اس سے سرخ رنگ بنایا جاتا ہے۔

اور اس کے نابینا پن نے اس کے لئے ایک ہی راستہ متعین کیا اور وہ تحصیلِ علم کا تھا چنانچہ اس نے اپنے والد سے لغت' نحو اور ادب کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح اپنے بعض بزرگوں اور ایک عالم یحییٰ بن مُسعر سے حدیث کا درس لیا۔ اس کے بعد وہ حلب چلا گیا اور وہاں جا کر اس نے سیف الدولہ کے دربار کے مشہور نحوی اور ماہر آثارِ ادب و تاریخ ابن خالویہ کے حلقے کے اہلِ علم سے ادب و لسانیات میں اکتسابِ فیض کیا۔ شام کے اکثر شہروں میں اُن دنوں کتب خانے ہوا کرتے تھے۔ صرف حلب میں بیس ہزار کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ جب ابوالعلاء نے س علمی خزانے سے فیض حاصل کر لیا تو مزید علم کی جستجو میں اس نے انطاکیہ اور طرابلس کا رخ کیا۔ انطاکیہ اُن دنوں بازنطینیوں کے قبضے میں تھا اور یہاں اور طرابلس میں امراء اور اہلِ ثروت نے بڑے بڑے کتب خانے قائم کر رکھے تھے۔ ابوالعلاء نے ان کتب خانوں سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا اور اپنے مطلب کی بہت سی تصانیف کو سن کر اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا۔

انسانی صلاحیتوں کے معاملے میں قدرت کا دستور کچھ ایسا ہے کہ اگر ایک طرف وہ ایک در بند کرتی ہے' تو دوسری طرف وہ ایک اور در کھول دیتی ہے۔ معرّی کی آنکھوں کا نور جب زائل ہو گیا تو قدرت نے اس کی تلافی اس طرح سے کی کہ اسے ایک بے پناہ حافظے کی دولت عطا کی۔ معرّی کا قول ہے کہ ''میں نے ایسی کوئی چیز نہ سنی جسے میں نے حفظ نہ کر لیا اور ایسی کوئی چیز حفظ نہ کی جسے میں بعد میں بھول گیا ہوں'' ابن العدیم اپنی کتاب ''الانصاف'' میں ابن منقذ سے روایت کرتا ہے کہ انطاکیہ کے ایک کتب خانے کے خازن نے مجھ سے کہا:

> ''میں نے تمہارے لئے ایک ایسی عجوبہ چیز چھپا رکھی ہے کہ اس طرح کی چیز تم نے کبھی دیکھی نہ سنی ہو گی۔ ایک نابینا لڑکا ہے جو روزانہ یہاں آتا ہے اور میں نے چند دن میں اسے متعدد کتابیں یاد کرا دی ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ میں کتاب کا ایک یا دو باب اسے پڑھ کر سناتا ہوں' تو وہ ان میں سے بعض مقامات' جن کے بارے میں اُسے شک ہوتا ہے دوبارہ سنتا ہے اور پھر وہ پورے کے پورے باب اپنے حافظے سے سنا دیتا

ہے...... چنانچہ وہ اس عجوبہ چیز کو میرے سامنے لایا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک چیچک زدہ چہرے والا بدرُو سا لڑکا تھا...... اور ایک طویل القامت شخص جو شاید اس کا کوئی رشتے دار تھا' اس کا ہاتھ تھامے پھرتا تھا''۔

ایک روایت جس میں شک کرنے کی مجھے کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی' یہ ہے کہ طرابلس جاتے ہوئے جب ابوالعلاء شہر لاذقیہ سے گذرا تو وہاں دَیرِ فاروس میں ٹھہرا۔ اس دَیر میں ایک راہب رہتا تھا جو اگلے وقتوں کے کچھ علوم کی باتیں کیا کرتا تھا۔ یہاں اُس کی زبانی ابوالعلاء نے قدیم فلاسفہ کے کچھ ایسے اقوال سنے جنھوں نے اسے اپنے بعض عقائد کے بارے میں شک میں مبتلا کر دیا' اور اس سے ان اقوال کا کوئی رد نہ بن پڑا۔ چنانچہ عام خیال یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد اس کے ذہن میں شک وتذبذب راہ پا گیا اور یہ کیفیت جس نے آگے چل کر اس کے سارے نظامِ فکر کو متاثر کیا' اُس کے اوائل زمانے کی شاعری میں بھی رونما ہو کر رہی۔ ابوالعلاء کے بعد کے کلام سے اس کے شواہد ملتے ہیں کہ اس نے ان سفروں میں مسیحیت اور یہودیت کا بھی کافی مطالعہ کیا تھا۔ مصری ادیب اور مصنف طٰہٰ حسین لاذقیہ کے اس واقعے کو اس لئے زیادہ قرینِ قیاس قرار دیتے ہیں کہ ایک تو دو مؤرخ قفطی اور ذہبی اس کے راوی ہیں' دوسرے لاذقیہ کا ذکر معرّی کی ایک نظم میں آتا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ ''لاذقیہ میں اسلام اور مسیحیت کے درمیان ٹھنی ہوئی ہے۔ ایک طرف پادری ناقوس بجاتا ہے تو دوسری طرف شیخ ہے جو غصے میں گرجتا ہے۔ ہر کوئی اپنے مذہب کی حمایت کرتا ہے۔ خدا جانے صحیح بات کیا ہے[1]''۔

حلب اور شام کے دوسرے شہروں میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ابوالعلاء لسانیات' نحو اور ادب میں کامل ہو گیا اور بیس برس کی عمر میں واپس معرّہ لوٹ آیا' اسی

۱۔ فی اللاذقیة فتنة — مابین احمد والمسیح
قس یعالج دلبة — والشیخُ من حنقٍ یصیحَ
کل یعزز دینه — یالیت شعری ما الصحیح!

اثناء میں اس نے اپنے اندر شاعری کی طرف میلان محسوس کیا اور گیارہ برس کی عمر سے ہی مشق سخن کرنے لگا۔ اگلے وقتوں کی طرح اس زمانے میں بھی شاعری کا ایک رائج اور ہر دل عزیز موضوع 'مدح' تھا جس کے وسیلے سے شاعر لوگ امراء و رؤسا کو خوش کر کے ان سے بھاری انعام واکرام پاتے اور اپنی معاش کا بندوبست کرتے تھے۔ یہ روایت دراصل عربوں میں زمانہ جاہلیت سے چلی آتی تھی' اور مدح سرائی ہر زمانے میں عربی شاعری کا ایک مستقل موضوع رہی تھی۔ فضا میں اُس وقت بھی شاعر متنبّی کے مدحیہ قصائد کی بازگشت سنائی دیتی تھی' اور فنِ شعر میں ابوالعلاء حمدانی دربار کے اس مِلک الشعراء سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ اس نے بھی اپنی شاعری کا آغاز مدح سرائی سے کیا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنی اس مدح سے کبھی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہ کی بلکہ اس سے محض مشق و ریاضت کا کام لیا۔ اپنے پہلے دیوان ''سقط الزند'' کے مقدمے میں وہ کہتا ہے:

ولم اطرق مسامع الرؤوساء بالنشید ولا مدحت طالبا للثواب' و انما کان ذالک علی معنی الریاضة و امتحان السوس

میں نے رؤساء کو اپنی نظمیں نہیں سنائیں اور نہ میں نے انعام کی خاطر مدح سرائی کی یہ سب کچھ ریاضت کے طور پر' اور اپنی طبع شاعر کو پرکھنے کی خاطر تھا۔

ابوالعلاء کی اس بات کی صداقت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ معرّۃ واپس آنے کے بعد پندرہ برس تک اس کی تمام تر آمدنی کا ذریعہ صرف تیس دینار سالانہ کا وہ وظیفہ رہا جو مقامی حکومت کی جانب سے اُسے اُس کی معذوری کے استحقاق کی بنا پر ملتا تھا۔ اپنے نابینا پن کی وجہ سے وہ ایک خادم رکھنے پر مجبور تھا۔ چنانچہ اس محدود وظیفے کا آدھا حصہ وہ اپنے خادم کو دے دیتا تھا اور باقی آدھا حصہ اپنے آپ پر خرچ کرتا تھا۔ اتنی قلیل رقم میں اس کی گذر اوقات ہو جاتی ہوگی یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو اس کی ضروریات زندگی کون مہیا کرتا تھا؟ اس کے وہ تلامذہ جو اس کے پاس تحصیلِ علم کے لئے آتے تھے یا اس کے متمول ماموں جن میں سے بعض شام کے شہروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے؟ ہمارے

لئے ان سوالوں کا جواب شاید اتنا اہم نہیں ہے۔ ہمارے لئے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ابوالعلاء کی غیرت اور عزت نفس نے یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ وہ کسی امیر یا حاکم کی شان میں قصیدہ کہہ کر اس سے انعام واکرام پائے اور اپنی مالی حالت آسودہ کرے۔ شروع کی دو تین نظموں کو چھوڑ کر جو بقول اس کے اس نے مشق وریاضت کی خاطر کہی تھیں' اس کے دیوان ''سقط الزند'' میں جتنی بھی مدحیہ نظمیں ہیں وہ بجائے امراء کے سب کی سب فقہاء اور اہلِ علم کی شان میں ہیں۔

حلب اور انطاکیہ اور طرابلس کے علمی سفروں سے واپس آنے کے بعد ابوالعلاء اپنے گھر میں مقیم ہوگیا۔ اس نے اب تک اتنا علم حاصل کرلیا تھا کہ اُسے اب کسی سے مزید کچھ سیکھنے کیلئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آگے چل کر وہ اپنے ماموں ابن سبیکہ کے نام ایک خط میں لکھتا ہے

ومنذ فارقتُ العشرين من العمر ما حدَّثتُ نفسي باجتداء علم من عراقيّ ولا شآميّ

جب سے میں نے اپنی عمر کے بیس برس پورے کئے میرے دل میں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ علم کی طلب میں کسی عراقی یا شامی عالم کے پاس جاؤں۔

معرّہ میں قیام کے پندرہ برسوں میں اس نے وہ تمام نظمیں کہیں جو اس کے پہلے دیوان ''سقط الزند[1]'' میں شامل ہیں۔ اس اثناء میں اس کی شاعری کا چرچا حلب اور شام کے دوسرے شہروں سے نکل کر عباسی دارالسلطنت بغداد جا پہنچا تھا۔ بغداد اُن دنوں صرف حکومت کا مرکز ہی نہیں علم وادب کا بھی کعبہ تھا' جہاں مملکت کے طُول وعرض سے آئے ہوئے اہل علم وہنر اور ادباء وشعراء جمع تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر کتب خانہ اُس شہر میں موجود تھا جن میں کتابوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی۔ علم وادب کی طلب رکھنے والوں کے لئے یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا۔ ان کتب خانوں کا تذکرہ ابوالعلاء نے بھی سن رکھا تھا' اور بغداد کا سفر اختیار کرنے کی خواہش اس کے دل میں

---

[1] ''سقط الزند'' کے لفظی معنی ہیں چقماق کی آگ سے نکلنے والی چنگاریاں۔ محاورۃً آتشِ تخلیق کے پہلے شرارے۔

بھی چٹکیاں لینے لگی تھی۔ لیکن اس کے لئے وہ مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔

یہ موقع اس کے لئے جلد ہی پیدا ہو گیا۔ ۳۹۵ھ میں جبکہ ابوالعلاء بتیس برس کا تھا' اس کے والد نے انتقال کیا[1]۔ ایک تو اس سانحے سے اس کی زندگی متاثر ہوئی۔ اور اس کے لئے معرّہ کو چھوڑ کر کہیں نہ جانے کا جو ایک بڑا سبب تھا وہ باقی نہ رہا۔ دوسرے یہ ہوا کہ اس کو تیس دینار سالانہ کا جو وظیفہ ملتا تھا وہ حلب کے ایک نئے گورنر نے آتے ہی بند کر دیا۔ گذر اوقات کے لئے ظاہر ہے اب صرف تدریس کا مشغلہ ہی اس کے پاس باقی رہ گیا تھا' جس کے لئے معرّہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع میدان بغداد میں تھا۔ چنانچہ ابوالعلاء نے بغداد جانے کا قصد کیا اور اس کے ایک ماموں نے اس کے سفر کے لئے ایک کشتی مہیّا کر کے دی۔ ۳۹۹ھ میں ہمارا یہ شاعر حلب سے روانہ ہو کر دریائے فرات میں اس کشتی میں سوار ہوا' اور تین ماہ کے ایک طویل اور پُر مصائب سفر کے بعد بالآخر بغداد پہنچ گیا۔

یہاں ابوالعلاء کی زندگی کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔ بغداد میں اس نے صرف ایک برس اور سات ماہ قیام کیا اور پھر معرّہ واپس آ گیا۔ اپنے خوابوں کے شہر بغداد سے اس کی اتنی جلد واپسی کی وجہ کیا ہوئی؟ اس کی والدہ کی علالت کی خبر' پیسے کی کمی' یا شعر و ادب کے ایک سرپرست کی اس کے ساتھ بدسلوکی؟ ان میں سے کوئی ایک وجہ یا دو یا تینوں؟..... جو کچھ بھی تھا وہ دارالسلطنت میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ بغداد کے قیام کا یہ مختصر سا عرصہ اس کی زندگی کا ایک ایسا موڑ ثابت ہوا جس نے اس کی آئندہ زندگی کا

۱۔ ابوالعلاء کے والد کے سالِ وفات کے بارے میں مارگولیوتھ سے لے کر عبدالعزیز میمن اور طٰہٰ حسین تک سب لوگوں سے تسامح ہوا ہے۔ سب نے معجم الادباء کے مصنف یاقوت الحموی کی تائید میں یہ سال ۳۷۷ھ قرار دیا ہے جبکہ معرّی کی عمر بمشکل چودہ برس تھی۔ ۱۹۴۲ء میں شام میں منعقدہ ہزار سالہ جشن معرّی کے موقع پر ایک مستشرق ڈاکٹر جبریل جبور نے اپنے مقالے میں اس تاریخ کے نادرست ہونے کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ اس واقعے کی صحیح تاریخ ۳۹۵ھ ہے جیسا کہ ابن العدیم نے کہا ہے' اور اس کے لئے اس نے ایک مضبوط دلیل یہ دی کہ معرّی نے اپنے والد کی وفات پر جو مرثیہ کہا اس میں چند اشعار ایسے ہیں جو چودہ برس کا ایک نوخیز لڑکا کسی صورت میں نہیں کہہ سکتا تھا..... ہم مستشرقین کو اکثر برا بھلا کہتے رہتے ہیں' لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ غلطی پر ہوں اور ہم ہمیشہ صحیح ہوں!

سارا طور ہی بدل کے رکھ دیا۔ چنانچہ اس نے معرّہ واپس آ کر اپنے آپ کو اپنے گھر میں یوں محبوس کیا کہ پھر اپنی موت تک ..... تقریباً پینتالیس برس کا عرصہ..... وہ کم ہی کہیں باہر گیا۔ یہ اس کی زندگی کا دوسرا اور طویل ترین دَور تھا اور اسی دَور میں اس نے اپنی شاعری کا انداز بدل کر اس کو اپنے فلسفہ وفکر کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور عربی شاعری میں ایک بالکل ہی نئی طرح ڈال دی!

ابوالعلاء کے ساتھ ہم بغداد ضرور جائیں گے۔ لیکن اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے پہلے دَور کی اس شاعری کے کچھ نمونے دیکھتے چلیں جو اس نے معرّہ میں رہتے ہوئے تخلیق کی تھی اور جس سے اس نے اپنا پہلا دیوان ''سقط الزند'' ترتیب دیا تھا۔ اس کی یہی وہ شاعری تھی جس کی شہرت اس سے بہت پہلے دوسرے شہروں سے ہوتی ہوئی دارالسلطنت بغداد تک جا پہنچی تھی!

☆.....☆.....☆

اپنے پہلے دیوان ''سقط الزند'' میں جو معرّی کے دَورِ شباب کی شاعری پر مشتمل ہے وہ بالعموم عربی شاعری روایت کے دائرے کے اندر رہتا ہے' اور اپنا خاص اسلوبِ سخن اور اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اُن سب موضوعات پر طبع آزمائی کرتا ہے جو عربی شاعری میں شروع سے لے کر اس کے زمانے تک متداول چلے آتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے عہد کے اصحابِ فضل وکمال کے لئے مدح سرا ہوتا ہے' بچھڑ جانے والے بزرگوں' عالموں اور فقیہوں کے مرثیے کہتا ہے اور فخر ومباہات پر آتا ہے تو اپنے بارے میں ایسے اشعار کہہ جاتا ہے جن سے لگتا ہے کہ اسے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا پورا شعور حاصل تھا' اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ان صلاحیتوں کی وجہ سے معاصرین میں اس کے حسّاد پائے جانے لگے ہیں۔ ہجو میں بھی اس نے کچھ اشعار کہے' اگرچہ کسی فرد معلوم کو سامنے رکھ کر اسے اپنی مذمت وبدگوئی کا ہدف نہیں بنایا۔ وصف وبیان میں وہ قدیم شعراء کی روش پر چلتے ہوئے اپنے شعروں میں سواری کے جانوروں' سفروں' محبوب شخصیتوں' سیف وسناں اور زرہ بکتر وغیرہ کی تصویر کشی کرتا ہے اور ان کے علاوہ چاند'

ستاروں اور مناظر قدرت کی بھی بات کرتا ہے۔ غزل (عشقیہ شاعری) کے موضوع[1] پر اس نے کچھ زیادہ تو نہیں کہا کہ اپنے نابینا پن اور اُس وقت کے معاشرتی حالات کی وجہ سے وہ کسی نسوانی وجود کی طرف مَیل و رغبت محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم غزلیہ شعروں کی چاشنی اس کے کلام میں یہاں وہاں مل ضرور جاتی ہے۔ ہاں ایک خاص بات جو معرّی کے اس پہلے دور کے کلام میں تواتر کے ساتھ سامنے آتی ہے وہ ''الحکمۃ والمثل'' ہے' یعنی شعروں میں حکمت و دانائی کی باتیں کرنا' ایسی باتیں جو اپنی سچائی کی وجہ سے رفتہ رفتہ کہاوت اور مثال کا درجہ اختیار کر لیں۔ شاعری کا یہ زمانہ اگرچہ اس کے دورِ شباب کا تھا جس میں انسان پر غلبہ عقل و خرد کا نہیں بلکہ جذبے اور جوش و ولولے کا ہوتا ہے' تاہم معرّی کے ایام شباب کی ان نظموں پر بھی فکر و دانش کی ایک نمایاں چھاپ دیکھی جا سکتی ہے۔

معرّی کے جو سوانحی تذکرے ہم تک پہنچے ہیں ان میں کہیں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسی عورت آئی تھی جس کی طرف اس نے جذباتی کشش محسوس کی ہو۔ چنانچہ اس کی عشقیہ شاعری پڑھتے ہوئے ہمیں اس کیفیت کی توقع تو نہیں کرنی چاہئے جو کسی شاعر کے کلام میں عشق کی آنچ سے گذرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ تاہم چونکہ غزل کے موضوع پر شعراء ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ کہتے چلے آئے تھے۔ وہ بھی یہ ریت نبھانا چاہتا تھا۔ اس غرض سے اس نے اپنے خیالوں میں ایک محبوب بسایا' اور اپنی شاعری میں اس سے باتیں کیں۔ یہ باتیں کچھ اس طرح کی ہیں کہ:

''اے اسیرِ پازیب! یہ کیا نادانی ہے کہ ایک نازک اندام جس کے لئے نظر اُٹھا کے دیکھنا بھی دوبھر ہو' وہ زیوروں کا بوجھ اٹھائے پھرے''

ایک اور شعر میں کہتا ہے

''کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں کسی راہ پر چلا ہوں تو تمہارا خیال میرا ہم سفر بن کر میرے ساتھ نہیں چلا

1۔ عربی زبان میں ''غزل'' شاعری کا ایک موضوع ہے' اس کی ایک ہیئت یا صنف نہیں' جیسا کہ اُردو میں ہے۔

'کبھی وہ میرے آگے ہوتا ہے اور کبھی پیچھے[1]''

ایک اور موقع پر شکوہ کرتا ہے کہ :

''تمہاری وجہ سے مجھ پر جو گذری ہے وہ اگر آفتاب کے ساتھ گذرتی تو مارے پژمردگی کے طلوع نہ ہوسکتا اور اگر برق کے ساتھ گذرتی تو چمکنا بھول جاتی۔''

یہ ساری باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں اور غزل کی شاعری میں شعراء اسی طرح کی باتیں اُس زمانے میں کیا کرتے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں ان میں معرّی کا خاص انداز نہیں پایا جاتا۔ یہ عباسی دور کے کسی بھی دوسرے شاعر کے شعر ہوسکتے ہیں' چاہے اس کا تجربہ عشق سچا ہو یا محض خیالی اور تصوراتی! معرّی کی عشقیہ شاعری پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے مجھے البتہ چند ایک شعر ایسے ضرور مل جاتے ہیں جن میں اس کا اپنا لب ولہجہ اور اپنا خاص طرزِ احساس دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک نظم جاہلی قصیدے کے نمونے پر تشبیب سے شروع ہوتی ہے اور اس کا مطلع ہے

منکِ الصُّدودُ و منّی بالصدودِ رِضیً
مَن ذا علیَّ بھذا فی ھَواک قضَی

''تمہاری جانب سے بے رُخی ہے اور میں اس بے رُخی پر راضی ہوں' وہ کون ہے جس نے تمہاری چاہت میں مجھے اس حال کو پہنچا دیا ہے۔''

محبوب کی سرد مہری اور بے پروائی کے مقابلے میں شاعر کا یہ رواقی (Stoical) رویہ اس وقت کی شاعری میں ایک نئی اور انوکھی چیز تھی۔ پھر معرّی نے یہ مضمون جس طرح سے باندھا ہے اور اس کے لیے الفاظ کی نشست اور صوتی کیفیت کا جس طرح سے خیال رکھا ہے اس سے یہ شعر عربی زبان میں ایک خوبصورت اور سبک

۱۔ بادیہ عرب کے تصورات کے مطابق بہترین ہم سفر وہ ہوتا تھا جو رات کے اندھیرے میں آگے آگے چلے اور دن کے اُجالے میں پیچھے پیچھے۔

چیز بن گئی ہے۔اس شعر کا پہلا مصرع ایسا ہے کہ اپنی نغمگی کی وجہ سے اپنے آپ زبان پر چڑھ جاتا ہے اور پھر ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتا۔ منكِ الصدود ومنی بالصدود رضیَ ! یہ مصرع میرا خیال ہے یک طرفہ محبت کرنے والوں کے لئے ایک منشور کا کام دے سکتا ہے۔اسی طرح اس کا ایک اور شعر ہے کہ

أبلى و دادی لكم زمان

ألين احداثه حديد

''آپ کے لئے میری محبت کو وقت نے فرسودہ کر دیا ہے۔ وقت جس کے نرم سے نرم واقعات بھی اپنی سختی میں مثل آہن ہوتے ہیں''

وقت کا ایک تصوّر تو وہ ہے جو فلاسفہ کے یہاں زمانۂ قدیم سے موضوعِ بحث چلا آتا ہے۔ دوسری طرف وقت کا ایک سادہ سا مفہوم ہم عام انسانوں کے نزدیک یہ ہے کہ وقت عبارت ہے حرکت سے اور تغیرِ احوال سے ! یہ وقت کی کارفرمائی ہی ہے کہ جو کل تھا وہ آج نہیں ہے' اور جو آج ہے وہ کل نہیں رہے گا۔ وقت کا اثر انسان کے اس جذبۂ عظیم پر کیا ہوتا ہے جس کا نام محبت ہے؟ معرّی اس بارے میں یہ کہتا ہے کہ وقت کی گرد اس گہرے اور عمیق انسانی جذبے کے نقوش کو بھی دھندلا کر دیتی ہے' اور جوں جوں وقت گذرتا ہے اور اس کے حوادث انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں تو محبت کے اس تعلق میں کہنگی اور پژمردگی کے آثار پائے جانے لگتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ معرّی نے یہ بات اپنے تجربے سے نہیں کی تھی' اس لئے کہ ایسا کوئی تجربہ اس کی زندگی میں تھا ہی نہیں۔ لیکن اپنے فہم ودانش سے اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جو اگلے زمانوں کے رومان پسندوں کے نزدیک بےشک بےتکی ہو۔ آج کے حقیقت پسندوں کے نزدیک وہ کافی حد تک صحیح اور واقعاتی ہے .... میرا خیال ہے یہ ایک عام تجربے کی بات ہے کہ جس طرح غم کی شدید کیفیت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا کرب ہلکا ہوتا جاتا ہے اسی طرح جذبۂ عشق کی آگ بھی وقت اور حالات کے اثر سے بالآخر ٹھنڈی پڑ جاتی ہے' اور اس کی راکھ میں کوئی دبی ہوئی چنگاری کبھی رہ جائے تو

رہ جائے' بعض حالات میں وہ بھی نہیں رہتی۔

معرّی کے اس پہلے دیوان میں چند ایک نظمیں ایسی ہیں۔ زیادہ تر مرثیے۔ جو اس کے اسلوبِ شعر گوئی کا بہت اعلیٰ اور عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اس کا بیشتر کلام اِن نظموں کے اسلوب اور انداز کا ہوتا تو عربی شاعری کی تاریخ میں معرّی کا شمار چوٹی کے گنے چنے شعراء میں ہوتا۔ ان میں سے زیادہ مشہور نظم ایک مرثیہ ہے جو اس نے اپنے ایک جوان فقیہ دوست' ابوحمزہ تنوخی کی موت پر کہا تھا۔ اس مرثیے کے شروع میں اور پھر آخری بند میں شاعر اپنے اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ موت زندگی سے اتنی قریب ہے کہ ان دونوں کے مظاہر میں بعض اوقات اشتباہ ہونے لگتا ہے' اور موت کے سوگ اور شادی کے نغمے میں بظاہر کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا' اس نظم کا مطلع ہے

غیر مُجد فی ملّتی و اعتقادی

نوح باکٍ ولا ترنّم شادٍ

''میرے عقیدہ و مسلک میں دونوں لا حاصل ہیں' ماتم گسار کا نوحہ ہو یا مطرب کا ترنم!''

اس سے اگلے شعروں میں کہتا ہے:

''اگر غور کیجئے تو سناؤنی دینے والے کی آواز بھی اُسی طرح ہوتی ہے جیسے کوئی گھر گھر خوش خبری سناتا پھرے''

''اور جھولتی ہوئی شاخ پر جو فاختہ کُو کُو بولی ہے۔ تو کون جانے یہ گریہ کر رہی ہے یا کوئی گیت گا رہی ہے''

''ہمارے اِس عہد کی قبروں نے تو اتنی ساری زمین گھیر رکھی ہے۔ وہ قبریں کیا ہوئیں جو قومِ عاد کے زمانے سے چلی آتی ہیں''

''زمین پر جب بھی چلو تو اپنا قدم ہلکا رکھو۔ اس لئے کہ زمین کی کھال اُنہی مرنے والوں کے جسموں سے ہی تو بنی ہے۔''

''کتنی ہی قبریں ایسی ہوں گی جو ایک سے زیادہ مرتبہ مدفن بنیں اور اپنے اندر متضاد انسانوں کے جمع ہو جانے پر خندہ زن ہوئے بغیر نہ رہ سکیں''

''رُبِّ اصغر کے ان دو چمکتے ستاروں سے پوچھو کہ انہوں نے روئے زمین پر اب تک کیسے کیسے لوگ دیکھے اور کیسی کیسی بستیوں کا مشاہدہ کیا''

''اور وہ (ستارے) کتنی مرتبہ دن چُھپنے پر نمودار ہوئے اور رات کے اندھیرے میں سفر کرنے والوں کو راستہ دکھایا''

''یہ زندگی تمام کوفت اور تھکن ہے، مجھے حیرت اس پہ ہے جو اس میں زیادہ کا طلبگار ہوتا ہے''

''اگر سوچو تو موت کی گھڑی کا غم اس مسرت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو ایک ولادت کے موقع پر محسوس کی جاتی ہے''

''اور انسان جو پیدا کئے گئے تو باقی رہنے کے لئے ہی پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ لوگ گمراہی میں ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اک دن ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیں گے''

''انسان فنا نہیں ہوں گے، صرف منتقل کئے جائیں گے، سعی و عمل کے اِس گھر سے اُس دوسرے گھر کو جس میں یا تو بدبختی ان کی منتظر ہو گی یا خوش طالعی!''

''موت کی استراحت ایک طرح کی نیند ہے جس سے جسم کو آرام ملتا ہے اور زندگی یوں سمجھو کہ جاگتے رہنے کا عمل ہے''

موت و حیات کے بارے میں اپنے ان خیالات کا اظہار کرنے کے بعد وہ اپنے مرحوم دوست کے مناقب بیان کرتا ہے اور اس کے احباب و اقارب سے کہتا ہے کہ اس کو اچھے طریقے سے الوداع کہو کہ آگے جانے والے کے لئے پُرخلوص الوداع ہی سب سے اچھا زادِ راہ ہو سکتا ہے اور اسی ضمن میں کہتا ہے کہ

وَاغسِلُوہ باالدَّمعِ ان کان طُھراً
وادفَنَاہ بَینَ الحَشَا والفُؤاد

''اسے اپنے آنسوؤں سے غسل دو، اگر یہ پاک ہوں اور اسے اپنے دل اور پہلو کے درمیان دفن کرو''

پھر وہ مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم اپنی جوانی کو ساتھ لئے اپنی راہ پر

چلے جاؤ۔ تم اس لائق ہو کہ دن اور رات کی گھٹائیں تمہاری منزل کو سیراب کریں گی اور تمہارے سوگ میں ایسے ایسے مرثیے کہے جائیں گے کہ اگر وہ آنسوؤں میں بدل جائیں تو لکھی ہوئی سطروں کو بہالے جائیں۔ نظم کے آخر میں وہ پھر موت اور فنا کے موضوع کی طرف آتا ہے' اور زحل' مریخ اور ثریا کے نام لے کر کہتا ہے کہ یہ سب ایک دن بجھ جائیں گے یا بکھر کر وسعتِ افلاک میں گم ہو جائیں گے اور یہی حال زمین پر ہر ٹھکانے کا ہوگا:

کل بیت للھدم ماتبتنی الور
قاء والسید الرفیع العماد

''جو گھر بھی بنا ہے' چاہے وہ کسی عالی مرتبت سردار کا ہو' یا ایک پھوہڑ فاختہ[1] کا ایک دن منہدم ہو کے رہے گا''

اور نظم کو اس شعر پر ختم کرتا ہے:

واللّبیب اللبیب من لیس یغتر بکون مصیرہ الفساد

''اور دانا تو صحیح معنوں میں وہی ہے جو ایک ایسے سنسار سے جس کا انجام خرابی ہے' دھوکا نہیں کھاتا''

آپ نے دیکھا کہ اپنے دوست کے مرثیے میں' موقع کو غنیمت جانتے ہوئے' معرّی ان تمام خیالات واحساسات کا اظہار کرتا ہے جو زندگی اور موت کے بارے میں اس کے دل ودماغ میں ایام شباب ہی سے پرورش پانے لگے تھے۔ اس نظم میں البتہ وہ حیات انسانی کی بقاء اور آخرت کی زندگی میں یقین رکھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن بعد کے ایک مرثیے میں جو اس نے اپنے باپ کی موت پر کہا تھا وہ اس بارے میں متذبذب اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس دنیا سے گذر جانے والوں کے متعلق ایک شعر میں اپنے تجسس کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

۱۔ عربوں کے یہاں فاختہ کو گھونسلا بنانے کے معاملے میں سخت پھوہڑ اور بے سلیقہ سمجھا جاتا ہے' چنانچہ ایک ضرب المثل ہے ہُو اخرقُ مِن حَمامۃ۔ وہ فاختہ سے بھی زیادہ اناڑی اور بدسلیقہ ہے۔

طلبت يقيناً من جُهينه عنهم
و لن تُخبريني يا جهين سوى الظن
فان تعهديني لا ازال مسائلاً
فاني لم اعط الصحيح فاستغني

''میں نے جُہینہ[1] سے پوچھا مجھے صحیح صحیح بتاؤ کہ ان (گذر جانے والے) لوگوں کے ساتھ کیا ہوا لیکن میں جانتا ہوں اے جہینہ کہ تم اس معاملے میں سوائے ظن وگمان کے اور کچھ نہیں بتا سکو گی۔''

''تم دیکھتی ہو کہ میں برابر سوال کئے جا رہا ہوں تو وہ اسی لئے ہے کہ مجھے اب تک شافی جواب نہیں ملا جس سے میرا تجسس جاتا رہے''

ایک اور نظم جو مدحیہ ہے اور جو معرّی نے الشریف موسیٰ بن اسحاق کے ایک قصیدے کے جواب میں کہی تھی' اس میں ایک شعر ایسا ہے جسے پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر کا خیال شاید معرّی سے لیا تھا۔ نظم کے ابتدائی اشعار ہیں:

''یارو میرا دل بہلاؤ کہ میری تابندہ آرزوئیں بجھ گئی ہیں' اور یہ اندھیرا ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا''

''اگر کچھ لوگوں کی چاہت کو تم بھلا بھی دو' تو کم از کم مجھے ان لوگوں میں رکھنا جو تمہیں ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔''

''کئی راتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اپنے سیاہ ملبوس کے باوجود صبح کی طرح حسین لگتی ہیں''

''ان میں ہم اپنے مشاغلِ لہو میں رواں دواں رہتے ہیں' جبکہ رات کا ستارہ اپنی جگہ حیران کھڑا دیکھتا ہے

.....

۱۔عربی میں ایک ضرب المثل ہے کہ وعند جُہینۃ الخبر الیقین: اصل واقعہ کا علم تو جہینہ ہی کو ہے۔ اس کے پس منظر میں یہ واقعہ ہے کہ قبیلہ بنی جہینہ کے ایک آدمی نے اپنے ایک ہم سفر حُصین غطفانی کو قتل کر دیا۔ اور جب وہ قیس کے قبیلے میں واپس آیا تو حصین کی بیوی اپنے خاوند کے بارے میں ہر ایک سے پوچھتی پھرتی تھی۔ اس پر اس نے یہ شعر پڑھا کہ ''وہ ہر سوار سے حصین کے بارے میں پوچھتی ہے حالانکہ اصل حقیقت کا علم تو جہینہ والوں کو ہے''

''اور مجھے آج کی یہ رات حبشی دلہن کی طرح لگی ہے' جو سفید موتیوں کی لڑیوں سے آراستہ ہو''

''اندھیری رات اور جنگل کی گھمبیرتا میں جب دُبِّ اصغر کے دوستارے طلوع ہوئے تو میرا ساتھی کہنے لگا''

اب آگے وہ شعر ہے:

نحن غرقی فکیف ینقذنا نجمان فی حومة الدجی غرقان

''ہم جو اندھیرے میں ڈوبے ہیں تو ہمیں یہ دوستارے کیا نجات دلائیں گے جو خود تاریکی کے سمندر میں غرق ہیں''

علامہ اقبال کا شعر ہے:

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
جو خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

کوئی شک نہیں کہ علامہ کا شعر نہ صرف اپنے خیال و معنی میں بلکہ زبان و بیان کے حسن میں بھی معرّی کے شعر سے بلند ہے' لیکن دونوں شعروں کے مضمون میں جو مماثلت پائی جاتی ہے اس سے یہ کوئی مستبعد نہیں لگتا کہ اوپر کا شعر کہتے وقت شاعرِ مشرق کے ذہن کے کسی گوشے میں اس نابینا شاعر کا مذکورہ بالا شعر ہو! ''ابوالعلاء معرّی'' کے عنوان سے ''بالِ جبریل'' میں ان کی جو نظم ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے معرّی کے بارے میں کافی کچھ پڑھ رکھا تھا اور اس کے دیوان ''لزومیات'' اور اس کی نثری تخلیق ''رسالتہ الغفران'' سے واقف تھے۔ چنانچہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس کا دیوان ''سقط الزند'' بھی ان کی نظر سے گذرا ہو اور اس کا یہ قصیدہ ان کے مطالعے میں آیا ہو۔

فخر و مباہات کے موضوع پر معرّی نے جو نظم کہی ہے' وہ اپنے ادبی و شعری حُسن میں اس کے کلام کی خوبصورت ترین چیزوں میں سے ایک ہے۔ میں اپنے ذوق کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ بلاغت' حُسنِ ادا' سلاست و بے ساختگی کے اعتبار سے معرّی اس نظم میں اُس مقامِ بلند پر فائز دکھائی دیتا ہے جہاں اس کے ساتھ امرؤالقیس' زُہیر اور نابغہ

جیسے جاہلی شعرا کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہاں اس کے ساتھ میں متنبّی کا نام بھی نہیں لوں گا کہ متنبّی میں تکلف ذرا زیادہ ہے' پھر وہ اپنے کلام میں صحتِ زبان اور قواعد کے معاملے میں کافی بے احتیاط ہے' جبکہ معرّی کا سارا کلام لغت و نحو میں سند کا درجہ رکھتا ہے۔ نظم کا مطلع ہے:

الا فی سبیل المجد ماانا فاعل

عفاف و اقدام و حزم و نائل

''میں جو کچھ بھی کروں اپنی آن اور شان کے لئے کرتا ہوں' چاہے وہ پاکدامنی ہو' بسالت ہو' قوتِ ارادی ہو یا جود و کرم ہو''

اگلے شعروں میں کہتا ہے :

کچھ لوگوں کے نزدیک میرے گناہ بے حساب ہیں اور میرا سب سے بڑا گناہ تو علوّ منزلت و فضلیت ہی ہے۔

.....

''میری شہرت شہر شہر پھیلی ہے' کوئی ہے جو پوری روشنی والے اس سورج کو چھپا سکے''

''میرے اندر جو چیز مضمر ہے اُس نے شب و روز کو بھی فکر و تردّد میں مبتلا کیا ہے' اور جو کچھ میں برداشت کئے ہوئے ہوں اس کا بوجھ پہاڑ بھی نہیں سہہ سکتے''

''اور میں اگرچہ آخری زمانے میں آیا ہوں تاہم میں وہ چیز لانے والا ہوں جو اگلے لوگوں سے بھی نہیں بن پڑی''

.....

''اور جب میں نے دیکھا کہ لوگوں میں جہالت عام ہے تو میں نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ لوگ سمجھے میں بھی جاہل ہوں''

''کیسی عجیب بات ہے کہ ایک ناقص انسان اُٹھ کر فضل و کمال کا دعویٰ کرے اور کیسے افسوس کا مقام ہے کہ ایک صاحبِ فضل و کمال یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہو کہ وہ ناقص ہے۔''

''اور جب مادر[1] حاتم طائی کو بخل کا طعنہ دینے لگے اور باقل[2] قس کو گونگا اور بے زبان بتائے''

''اور جب وہ ننھا سا مدھم ستارہ سُہیٰ سورج سے کہے کہ تم دکھائی نہیں دیتے اور جب اندھیرا صبح کو یہ عیب لگائے کہ تمہارا رنگ پھیکا اور زرد ہے''

''اور زمین اپنی حماقت سے آسمان کے منہ آنے لگے اور کنکر پتھر اپنا مقابلہ ستاروں سے کرنے لگیں''

''تو اے موت نزول کر کہ یہ زندگی مذموم ہو چلی ہے اور اے نفس متانت کا دامن تھام کہ زمانہ تمسخر پر اُتر آیا ہے''

☆.....☆.....☆

اوپر ذکر ہوا کہ عام نقادوں کی رائے کے مطابق اپنے اس پہلے دور میں ابوالعلاء معرّی نے بعض نظمیں ایسی کہی ہیں جن میں وہ فن شعر گوئی کی آخری بلندیوں کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظمیں تعداد میں آٹھ دس یا اس سے کچھ زیادہ ہوں گی (جبکہ پورا دیوان ۶۳ نظموں پر مشتمل ہے) یہاں سوال یہ ہے کہ ''سقط الزند'' کی یہ چند گنی چُنی نظمیں ہی کیوں اس کے فن کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہیں۔ دیوان کی دوسری نظموں کے بارے میں یہ بات کیوں نہیں کہی جا سکتی؟.....اس کا ایک سیدھا اور دیانتدارانہ جواب معرّی کی زبانِ حال سے یوں ہوگا

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی!

ابوالعلاء معرّی کو جس چیز نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور جس سے اس کی تخلیقات کے ایک بڑے حصے کا حسن گہنا کے رہ گیا ہے۔ وہ زبان و بیان کے معاملے میں اس کی مشکل پسندی اور اس کا شوقِ اظہارِ کمال ہے۔ اس کی طبع شاعر کا یہ نرالا پن (Eccentricity) اس کے پہلے دیوان ''سقط الزند'' اور اس کی نثری تخلیق ''رسالتہ

۱۔ مادر قدیم عرب معاشرے میں ایک بے حد بخیل شخص تھا۔ عربی میں مثل ہے اَبخَلُ من مادر: مادر سے بھی زیادہ کنجوس۔

۲۔ باقل ولادی زمانۂ جاہلیت میں بہت ہی کم گو شخص تھا اور قس بن ساعدہ بہت بڑا خطیب تھا جو عکاظ کے میلے میں تقریریں کرتا تھا۔

الغفران'' میں زیادہ مواقع پر اور اکثر ناپسندیدہ صورت میں سامنے آتا ہے جبکہ اس کے دوسرے دیوان ''لزومیات'' میں اس کا بیان تو سادہ اور صاف ہو گیا ہے' لیکن شاعر کی مشکل پسندی نے یہاں ایک دوسری صورت اختیار کی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ چھ سال کی عمر میں جب معرّی کی آنکھوں کا نور پوری طرح جاتا رہا تو قدرت نے اس نقصان کے عوض اسے ایک حیرت انگیز اور افسانوی (Mythical) قسم کا حافظہ عطا کیا۔ اس حافظے کی مدد سے ہمارے شاعر نے جہاں دوسرے علوم حاصل کئے وہاں عربی لغت سے بھی آگاہی حاصل کی اور عربی الفاظ و محاورات کا پورا ذخیرہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ چنانچہ عربی زبان و روزمرہ پر اس کے عبور کا یہ عالم تھا کہ اس کے کلام کا ایک شارح تبریزی کہتا ہے ''میں نہیں سمجھتا کہ عرب قوم نے آج تک کسی چیز کیلئے کوئی لفظ بولا ہو' اور معرّی اس سے آشنا نہ ہو'' اُس زمانے کے اہل نقد و نظر کہتے تھے کہ ''ایک ماہرِ لغتِ عرب مشرق میں ہے اور دوسرا مغرب (اندلس) میں' اور ان کے سوا تیسرا کوئی نہیں' یعنی ابوالعلاء معرّی اور ابن سیدہ''۔ لغتِ عرب پر اس کامل دسترس نے جہاں ابوالعلاء کو مرجع خلائق بنا دیا اور علومِ لغت و نحو و عروض میں اسے استاد اور امام کا درجہ عطا کیا' وہاں اسے اس شوقِ فضول میں بھی مبتلا کر دیا کہ موقع بے موقع اپنے لغوی کمالات کا اظہار کر کے لوگوں پر اپنی دھاک بٹھائے۔ اس کی خاطر وہ اپنے اشعار میں مروّج اور روزمرہ استعمال کے الفاظ چھوڑ کر اکثر ایسے مشکل اور نامانوس الفاظ و مفردات لاتا جو بادیۂ عرب میں بے شک سمجھے جاتے ہوں' شہروں میں بسنے والوں کے لئے عام فہم نہیں ہوتے تھے اور بغیر لغت سے رجوع کئے نہیں سمجھے جا سکتے تھے۔ اسی طرح وہ چونکہ تاریخ اور ایامِ عرب کا بھی عالم تھا۔ اپنے شعروں میں وہ جا بجا ایسے ایسے تاریخی حوالوں اور رموز و اشارات سے کام لیتا کہ جن کی طرف ایک عام سامع یا قاری کا ذہن منتقل نہیں ہو پاتا تھا۔ پھر معاملہ صرف لغت اور زبان تک محدود نہیں تھا۔ شاعری کے مضمون اور خیال میں بھی اس کی کوشش عموماً یہ ہوتی تھی کہ شعراء کی عام روش سے ہٹ کر کوئی بات کرے اور اپنے شعروں میں کوئی

دور کی کوڑی لائے جسے سن کر لوگ حیران و مبہوت رہ جائیں۔ اپنی اس عجوبہ خصوصیتِ مزاج (Ideosyncracy) سے میں سمجھتا ہوں اس نے انجانے میں اپنی شاعری کے ایک بہت بڑے حصے کا حسن غارت کر دیا۔ چنانچہ اس کے دیوان ''سقط الزند'' کی بیشتر نظمیں اس کی اس تعقید لفظی اور پُر تصنع انداز بیان کا شکار ہو کے رہ گئی ہیں۔ لیکن جب جب وہ اپنے اس رجحان طبع کو دبانے میں کامیاب ہوا ہے اور اس پر ایک شاعرانہ خیال جس طرح سے نازل ہوا ہے اُس نے اسی طرح اُسے نظم کر دیا ہے' اور آمد کو آورد نہیں ہونے دیا۔ وہ فن کی بلندیوں تک جا پہنچا ہے۔ ایک مصری ادیب احمد الشایب نے دمشق میں منعقد ہونے والی معرّی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر ایک مضمون پڑھا تھا جس کا عنوان تھا' ابوالعلاء معرّی..... کیا وہ ایک شاعر تھا یا فلسفی؟'' اس میں وہ معرّی کے دالیہ مرثیے پر' جو اس نے اپنے فقیہہ دوست کی موت پر کہا تھا' اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس میں حسنِ بیان اور رفعت فکر و خیال دونو اس طرح سے یکجا اور ہم آہنگ ہوئے ہیں کہ اس کی مثالیں عربی شاعری میں دور دور تک نہیں ملتیں۔ اس کے الفاظ میں ''ابوالعلاء نے دراصل اپنی ساری نظم میں ساری دنیا کا مرثیہ کہا ہے' اور وہ زندگی اور موت کے درمیان کسی برزخ میں کھڑا اس بات پر آنسو بہاتا ہے کہ آخرت کی زندگی اس دنیا کی زندگی کے درپے کیوں ہے' اور موت کو زندگی پر غلبہ و استیلاء کیوں حاصل ہے'' آگے کہتا ہے ''اگر ابوالعلاء کی ساری شاعری یا زیادہ تر شاعری اِس نظم کے نمونے کی ہوتی تو اُس کے مقابلے میں کوئی عرب شاعر بھی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ یقیناً شعرائے ادب کا سردار قرار پاتا''..... احمد الشایب کی رائے سے کوئی چاہے تو بے شک اختلاف کر سکتا ہے لیکن مجھے اس کی بات میں کافی صحت اور وزن دکھائی دیتا ہے۔

جو کچھ بھی ہو' ابوالعلاء جب بغداد جانے لگا ہے تو اُس کی ان سب نظموں کی شہرت وہاں اس سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ لوگ اب اُس شاعر کو دیکھنا اور اُس سے ملنا چاہتے تھے جس نے آنکھوں سے معذور ہوتے ہوئے بھی یہ دعویٰ کیا کہ میں اگرچہ آخری زمانے

میں پیدا ہوا ہوں لیکن میں جو بات کہنے چلا ہوں وہ پہلے کسی سے نہیں بن پڑی۔ معلوم نہیں لوگوں نے اس کے اس دعویٰ کو کتنی سنجیدگی سے لیا ہوگا۔ تاہم وقت نے بالآخر ثابت کر دیا کہ جو باتیں معرّی اپنے دیوان ''لزومیات'' میں کہہ گیا وہ نہ اس سے پہلے کسی نے کہی تھیں اور نہ بعد میں فکر و فلسفہ اور آزادی اظہار کے غلغلے کے باوجود کوئی کہہ سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ معرّی اپنے وقت سے ایک ہزار سال پہلے پیدا ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆